سائنس اور فلسفہ کی ترقی میں قرآنِ کریم کا حصہ

مولانا محمد حنیف ندوی

مولانا محمد حنیف ندوی (1908ء - 1987ء) ماضیِ قریب کے فلسفی مزاج عالم و ادیب تھے۔ "سائنس اور فلسفہ کی ترقی میں قرآنِ کریم کا حصہ" کے عنوان سے ان کا یہ مضمون ماہنامہ "المعارف" (لاہور) کی جون 1967ء کی اشاعت میں طباعت پذیر ہوا تھا۔اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے قارئینِ "الواقعۃ" کی ضیافتِ علمی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ الواقعۃ)

اسلام کی اثر آفرینیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس نے جہاں توحید کے اَسرار فاش کیے ہیں۔ عظمت انسانی کا پرچم لہرایا ہے، اخلاق و سیر کے گوشوں کو پاکیزگی عطا کی ہے، جہاں دلوں میں محبت الٰہی کی شمعوں کو روشن کیا ہے اور ایسے پاکیزہ اور ایسے اونچے معاشرہ کی تخلیق کی ہے کہ جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ عالم قاصر ہے۔ وہاں مذاہب عالم پر اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے فکر و تعمق کے دواعی کو ابھارا ہے، عقل و خرد کے اجالوں کو عام کیا ہے اور دنیا کے تیرہ و تاریک افق پر استدلال و استنباط کے نئے نئے آفتاب ابھارے ہیں۔

کیا یہ بات آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے کہ بادیہ نشینانِ عرب تھوڑے ہی عرصے میں تہذیب و تمدن کے فرازِ اعلیٰ پر فائز ہو جائیں، حکمت و دانش کے افسردہ میکدوں میں پھر سے جان ڈال دیں، اور علوم و فنون کے اجڑے ہوئے دریا میں چہل پہل پیدا کر دیں، اور کیا یہ امر تعجب خیز نہیں کہ عرب کی اُمی اور ناآشنائے حرف قوم دیکھتے ہی دیکھتے فلسفہ و حکمت کے تخت داد رنگ پر تسلط جمالے اور نہ صرف یونانیوں کے بادہ فکر و اندیشہ سے تشنہ کامان ادراک کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے بلکہ اس کے جرعوں میں کیف و ذوق کی ان سرمستیوں کا بھی اضافہ کر دے جو اسلام کی دعوت عرفاں کے ساتھ خاص ہیں۔

ہماری رائے میں یہ محیر العقول انقلاب نتیجہ ہے قرآن حکیم کی ان تعلیمات کا جن سے تحقیق و تجسس کی روح بیدار ہوئی اور یہ تبدیلی اور عظیم تغیر مرہون منت ہے اس وحی کا جس کا حرف آغاز اقراء ہے۔

قرآن حکیم نے کیوں کر مسلمانوں میں خالص علمی ذوق کی پرورش کی اور کس طرح ان کے اسلوب فکر کو سائنس اور فلسفہ کے حسین سانچوں میں ڈھالا؟ اس سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں ان چار نکات پر غور کرنا ہو گا۔

(1) قرآن حکیم نے اس عالم ہست و بود کی معروضیت (Objectivity) کو واشگاف الفاظ میں تسلیم کیا۔ زندگی کو احترام کی نظر سے دیکھا اور بتایا کہ مسلمان کا نصب العین دنیا و آخرت کے حسن اور نکھار سے بہرہ ور ہونا ہے۔

(2) اس کتاب ہدیٰ نے اس حقیقت کو کھول کر بیان کیا کہ اس کائنات میں جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے نظام و قاعدہ کی استواریاں پائی جاتی ہیں، اور اس کی تخلیق میں متعین غرض و غایت پنہاں ہے۔

(3) اسی صحیفہ مبارکہ نے پہلے پہل اور ہمیشہ کے لیے اس مغالطہ کو دور کر دیا کہ دین اور عقل و خرد کے تقاضوں میں تضاد رونما ہے۔

(4) اور یہ بھی اسی کتاب کا اعجاز ہے کہ اس نے فکر و استدلال کی ان راہوں کی طرف رہنمائی کی جنہیں ہم منطق کی اصطلاح میں استقرار (Induction) کہتے ہیں۔

اس کائنات کی نوعیت کیا ہے؟ آیا یہ خوب صورت آسمان، یہ ہرے بھرے اشجار، یہ سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے دریا، یہ ٹھوس پتھر اور استادہ پہاڑ حقیقی وجود سے بہرہ یاب ہیں یا ان کا وجود محض باطل اور نظر و خیال کی سیمیائی ہے؟ اس بارے میں ارباب فلسفہ و مذہب میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن علوم و فنون کی پرورش وار تقاء سے متعلق دو بالکل ہی متضاد نظریے دنیا میں رائج رہے ہیں۔ اگر کائنات موجود ہے اور یہ عالم ہست و بود وجود خارجی سے متصف ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے فکر و نظر کا صحیح اسلوب اختیار کیا ہے اور علوم و فنون کی نشاط و آفرینیوں اور تہذیب و تمدن کی نقش آرائیوں کے لیے وجہ جواز ڈھونڈ لینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

اگر اس عالم کی حقیقتیں صرف تصور (Idea) یا صورت (Form) کا کرشمہ ہیں یا ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے زندگی کی اہمیتوں کو گھٹایا ہے اس کی غرض و غایت کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے، اور ایسی راہبانہ اور غیر عمرانی زندگی کی حوصلہ افزائی کی ہے جس سے انسانیت کو بجز قنوط اور مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوا ہے۔

نفی و ایجاب کے یہ دونوں راستے نہ صرف جدا جدا ہیں بلکہ دونوں مختلف منزلوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایجاب کے معنی زندگی کی گہما گہمی اور ارتقاء کے ہیں۔ علم و فن کے فروغ کے ہیں۔ آگے بڑھنے اور کائنات کی ناہمواریوں پر قابو پانے اور اس کو اپنے دائرہ تسخیر میں لانے کے ہیں، اور نفی کا مطلب محرومی، یاس، قنوط اور جہل و نادانی یا جمود و پسماندگی کو اپنانا ہے۔

اس بنا پر اسلام نے اس عالم آب و گل کو اگر تسلیم کیا ہے تو اس کے معنی صرف یہاں کی ابھرتی ہوئی اور نمایاں و محسوس حقیقتوں کو مان لینے ہی کے نہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے انسانی علم و بصیرت پر پورے پورے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اور فکر و نظر کا ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جس کی یقین افروزی کسی تشکیک کی متحمل نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلام نے کائنات کی معروضی حیثیت کو مان کر اس اساس اور بنیاد کی نشاندہی کی ہے کہ جس پر آگے چل کر انسانی فکر و تجربہ کے غرفے استوار ہوتے ہیں۔

یونانی حکما کی اکثریت اس عالم رنگ و بو کو مانتی تھی ان میں استخوانِ نزاع صرف یہ دو باتیں تھیں کہ اس کی ترکیب و ساخت میں کن عناصر کو دخل ہے۔ یا یہ کہ یہ عالم، ساکن و راکد (Static) ہے یا متحرک (Changing) افلاطون ان میں پہلا شخص ہے جس نے اس مسلمہ سے انحراف اختیار کیا، اور بحث و نزاع کے اس دھارے کو ڈھائی سو سال کے بعد اس نقطہ کی طرف موڑ دیا کہ جس عالم مادی کی ترکیب و ساخت کے بارہ میں اب تک میدان مناظرہ گرم رہا اس کے متعلق سوچنے کی بات در اصل یہ ہے کہ آیا یہ عالم حقیقی عالم بھی ہے یا نہیں، افلاطون کے نزدیک یہ دنیا حقیقی دنیا کا محض عکس یا نقش (Copy) ہے اور وہ حقیقی، مکمل اور غیر متغیر دنیا صرف تصور (Idea) یا صورت (Form) کی جلوہ گری سے تعبیر ہے۔

Mujalah AlWaqia Karachi :::Al-Waqia.Blogspot.com:::AlWaqiaMagzine.Wordpress.com:::مجلہ الواقعہ

افلاطون کا اشکال دراصل اس عالم کی ناہمواریوں پر مبنی ہے۔ وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ یہاں نقص (Imperfection) یا شر (Evil) ہی کا دور دورہ ہے، زلزلوں کی تباہ کاریاں اور تغیر و فنا کی ہولناکیاں ہیں تو وہ ایسے عالم کو حقیقی عالم ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ اس نقص یا شر کو ڈیمی ارج (Demiarge) کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا کہ جس نے ان تصورات کاملہ اور نصب العینی صور کو مادہ میں مرتسم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نقص مادہ کا ہے۔ اس کی صلاحیت قبول و پذیرائی کا ہے کہ ان کامل تصورات کو پوری طرح اپنا نہیں سکا ہے۔

افلاطون نے کائنات کی اس تعبیر سے گو تصوریت (Idealism) کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر اس عالم مادی کی مکمل نفی پر منتج ہوئی تاہم اتنا غنیمت ہے کہ اس نے ایک صورت گر ازلی (Devine Sculptor) اور مادہ کے وجود کو بہر حال تسلیم کیا۔

عیسائیت نے جب اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ مذہبی اذعانیات کو عقل و خرد کی روشنی میں پیش کیا جائے تو اسے افلاطون کے نظریات اور پلاٹینیوس کی تشریح، پذیرائی کے لیے زیادہ موزوں معلوم ہوئی، جن میں تصور یا روح کو قدرتاً فوقیت و امتیاز حاصل ہے اور جسم کی حیثیت ایسی برائی یا رکاوٹ کی ہے جو قلب و روح کی پرواز اور ترقیامت میں حائل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک ایک شخص جسم کے تقاضوں سے رستگاری حاصل نہیں کرلیتا اور جسمانی خواہشوں اور ولولوں سے دامن کشاں نہیں رہتا اس وقت تک نجات کے استحقاق سے محروم رہتا ہے ظاہر ہے یہ طرز فکر سراسر زندگی کی ٹھوس اور ضروری حقیقتوں سے گریز اور فرار پر مبنی ہے اور سوچنے کے اس نہج کا منطقی نتیجہ ہے جس کو افلاطون اور اس کے شارح پلاٹینیوس کے تتبع میں عیسائیت نے اختیار کیا۔

اگر کائنات کے مظاہر معروضیت سے متصف ہیں تو پھر جسم بھی معروضی ہے اور اس کے تقاضے بھی اپنی آغوش میں معروضیت لیے ہوئے ہیں اور اس بنیاد پر اگر غور کیجیے تو ان تقاضوں اور خواہشوں کی پرورش اور ارتقاء کا مسئلہ بھی بجائے حسیت کے حقیقت نگری قرار پاتا ہے۔ اس بارہ میں فیصلہ کن نکتہ در اصل یہ ہے کہ کوئی بھی عمل، یا تگ و پو کی کوئی بھی صورت حتیٰ کہ مجاہدہ اور ریاضت بھی ان معنوں میں روحانی نہیں ہے کہ اس میں قطعاً جسم کا حصہ نہیں ہے، خواہش و تمنا کی کار فرمائی نہیں ہے، ہمارے نزدیک کسی عمل یا فعل میں، جو بہر حال جسمانی ہی ہوتا ہے۔ روحانیت کا عنصر اس وقت ابھرتا ہے جب آپ اس کو ان محرکات نفسی کی بناء پر اختیار کرتے یا انجام دیتے ہیں جو کسی عظیم نصب العین یا کسی بلند قدر سے تعلق رکھتے ہیں یعنی جب یہ فعل یا عمل ذاتی منفعت کی سطح سے اونچا ہو کر کسی آفاقی یا انسانی مطمح نظر سے ہمقراں ہوتا ہے۔ ورنہ کوئی فعل یا عمل اپنے روپ میں روحانی یا غیر روحانی نہیں ہوتا۔ عمل و فعل کی یہ ثنویت اس غلط مفروضے پر مبنی ہے کہ انسان جسم و روح کی دو بنیاد حقیقتوں سے ترکیب پذیر ہے۔ حالانکہ جسم و روح دو علیحدہ علیحدہ اور مختلف چیزوں کا نام نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت انسانی کے دو پہلو ہیں۔ دو پر تو ہیں زیادہ واضح لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ انسان کے سوچنے اور عمل کرنے کی دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح کو ہم روحانی کہتے ہیں اور ایک جسمانی۔

عالم و مافیہ کو غیر حقیقی قرار دینے کی دوسری واضح مثال ہمیں ہندو اصول "مایا" میں ملتی ہے جس کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہے کہ یہ دنیا اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ دھوکہ ہے اور ہرگز اس لائق نہیں کہ انسان یہاں رہے۔ یہاں کی دلچسپیوں سے دل بہلائے۔ یا تہذیب و تمدن کی طرفہ طرازیوں کو شائستہ اعتناء سمجھے۔

" مایا" کے اس منفی فلسفہ نے زندگی کے کارزار میں اپج، جرات اور تخلیق و اختراع کی نشاط آفرینیوں سے ہندوؤں کو کس درجہ محروم رکھا، یہ صرف تاریخ ہی کا مسئلہ نہیں زمانہ حال کا اشکال بھی ہے۔ کیونکہ اس کی تہہ میں سوال یہ پوشیدہ ہے کہ آیا عالم کے بارہ میں یہ غیر سائنسی اور غیر ہمدردانہ نقطہ نظر انسانوں میں تحقیق و تجسس کی روح بیدار کر سکتا ہے، اور اس کائنات سے متعلق اس گہرے لگاؤ، عمیق توجہ اور مبنی بر کاوش التفات کو پیدا کر سکتا۔ جو علم و عرفان کے لیے بمنزلہ اولیں شرط کے ہے۔ رادھا کرشنن نے Eastern Riligions and Western Thought میں اعتراض کے اس تیکھے پن کو محسوس کیا ہے اور جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے جواب کی نوعیت سے ڈاکٹر شویزر (Schwitzer) کی تسکین ہوتی ہے یا نہیں۔ "مایا" کی اس فلسفیانہ اور متصوفانہ تعبیر سے ہم صرف یہ بات سمجھ پائے ہیں کہ ہندو اہل فکر نے مغربی تہذیب کے زیر اثر اس خلیج کو بالآخر محسوس کر ہی لیا ہے، جو زندگی کے تقاضوں اور زندگی کی نفی کے مابین حائل ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس خلیج کی نشاندہی سب سے پہلے اسلام نے کی لیکن اس وقت نہ عیسائی اقوام نے اس پر غور کیا اور نہ ہندو فلسفہ نے " مایا" کی اس نئی تعبیر و تشریح کی ضرورت سمجھی۔ لیکن اب جبکہ زمانہ کے ارتقاء نے دونوں کو زندگی کی شورشوں میں دھکیل دیا ہے۔ دونوں ہی جان گئے ہیں کہ رہبانیت اور " مایا" کا فلسفہ موجودہ زمانہ میں چلنے والا نہیں۔

یہ جان لینے کے بعد کہ کائنات کی معروضی حیثیت تسلیم کر لینے سے کیونکر سائنسی ذہن اور مزاج پیدا ہوتا ہے اور اس نقطہ نظر کو اپنا لینے سے تہذیب و تمدن کے مختلف گوشوں میں کس درجہ دوررس اور خوش گوار تبدیلیاں معرض وجود میں آتی ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو کس کس اسلوب سے بیان کیا ہے۔ سورہ انبیاء میں ہے:

(أَوَلَمْ يَرَالَّذِيْنَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهُمَا وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ) ((30))

" کیا کافروں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے جلے تھے ہم نے ان دونوں کو جدا جدا کر دیا اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں کیا اس پر بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔"

(2) سورہ عنکبوت میں ارشاد فرمایا:

(خَلَقَ اللّٰهُ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضَ بِالْحَقِّ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ) ((44))

"خدا نے آسمانوں اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا اور اس میں یقیناً صاحب ایمان لوگوں کے لیے نشانی ہے۔"

سورہ غاشیہ میں آیا ہے:

Mujallah AlWaqia Karachi :: Al-Waqia.Blogspot.Com :: AlWaqiaMagzine.Wordpress.Com :: مجلہ الواقعۃ کراچی

(أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۔ وَ إِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ، وَ إِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۔ وَ إِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ) ((71-20))

"کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے عجیب روپ میں ان کو پیدا کیا گیا ہے اور آسمانوں کی طرف نظر نہیں دوڑاتے کہ کیسا بلند کیا گیا ہے، اور پہاڑوں کے بارہ میں نہیں سوچتے کہ کس طرح استادہ کیے گئے ہیں اور زمین پر غور نہیں کرتے کہ کس طرح اس کو ان کے پاؤں تلے بچھایا گیا ہے۔"

سورہ ملک میں ہے:

(وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ) ((5))

"اور ہم نے قریب کے آسمانوں کو ستاروں کے چراغوں سے زینت بخشی۔"

سورۃ شوریٰ میں وضاحت فرمائی:

(فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ)((الشوریٰ:11))

"آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔"

سورہ نحل میں اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ کائنات کو معروضیت کے لباس سے آراستہ کرنا، اور تخلیق و اختراع کے خلعت سے نوازنا ہی تو وہ صفت ہے جس کی وجہ سے ہمیں اپنی تمام مخلوق سے امتیاز حاصل ہے۔

(أَفَمَن يَخْلُقُ كَمَن لَّا يَخْلُقُ) ((17))

"کیا جو تخلیق و ابداع سے کام لیتا ہے وہ ایسا ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کر سکے۔"

تخلیق عالم کے لیے قرآن حکیم نے جو پیرایہ بیان اور الفاظ بیان کیے ہیں، ان سے ان تمام تصورات کی نفی ہو جاتی ہے کہ جن کو تصوریت نے جنم دیا ہے۔

دوسرا نقطہ بھی کچھ کم اہم نہیں اگر یہ عالم، بخت و اتفاق کا کرشمہ نہیں بلکہ اس کو حکیم و دانا خدا نے بنایا ہے تو پھر ضروری ہے کہ اس میں نظم و ترتیب ہو۔ قاعدہ اور قانون ہو اور اس کو اس نہج سے ڈھالا جائے کہ انسان اس سے پورا پورا استفادہ کر سکے۔

جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے اس نے کائنات کے بارہ میں بار بار اس حقیقت کو پیش کیا ہے کہ اس کارگاہ حسن میں کہیں بھی بھونڈا پن یا نقص نہیں۔ کہیں بھی نظم و ترتیب کی کوتاہیاں نہیں۔ یہاں ہر چیز کا ایک انداز ہے اور ہر شے قرینہ اور ڈھنگ کی آئینہ دار ہے۔

قرآن حکیم اس عالم کو انسانی اغراض و مفادات کے منافی قرار نہیں دیتا۔ اس کو معاند اور غیر ہم آہنگ نہیں مانتا بلکہ اس کو اس لائق ٹھہراتا ہے کہ انسان یہاں رہ سکے۔ اس کی نشاط آفرینیوں میں شریک ہو سکے اور اس کے حسن اور نکھار سے ذوق و کردار کی زلف دوتا کو سنوار سکے۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کہنا چاہیے کہ اس کے اندر پنہاں ان جاری و ساری قوانین کو جان سکے، اور ان کو معاشرہ کی بہتری اور بہبود کے لیے استعمال کر سکے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ سائنس کو فی نفسہ غرض و غایت سے کوئی سروکار نہیں اس کا موضوع بحث تو صرف یہ ہے کہ یہ مادہ کے مضمرات ارتقاء کو معلوم کر سکے اور اس علم کی روشنی میں تجربہ و آگاہی کے مزید قدم اٹھا سکے۔ اس کا دائرہ بحث صرف "ہے" (is) تک ہے۔ "چاہیے" (Ought) اس کے حدود بحث سے خارج ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ خالص سائنسی نقطہ نظر سے یہ عالم کسی غرض و غایت کی طرف رہنمائی نہیں کرتا۔ یا یوں کہنا چاہیے اس بارہ میں اس کی روشنی قطعاً غیر جانبدارانہ ہے۔ اس سے نہ تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ عالم بامقصد ہے اور اس چیز کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ بامقصد نہیں ہے۔ لیکن اگر فلسفیانہ نقطہ نظر سے دیکھیے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس عالم میں بغیر غرض و مقصد کو مانے اور بنا کسی غایت و معنی کے تسلیم کیے، مظاہر ہستی کی کوئی معقول توجیہ ممکن ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں دو ٹوک سوال یہ ہے کہ یہ عالم مادی کیوں قاعدہ قانون کی افادیتیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ پانی کیوں پیاس بجھاتا ہے، کھانے سے کیوں سیری اور توانائی حاصل ہوتی ہے اور معدہ کی ترکیب و ساخت کیوں اس وضع کی ہے کہ وہ کھانوں کو آسانی سے جزو بدن بنا سکے۔ اسی طرح عقاقیر اور جڑی بوٹیوں میں صحت بخشی کی صلاحیتیں کیوں مضمر ہیں۔ زیادہ واضح لفظوں میں جواب طلب یہ سوال ہے کہ یہ عالم اور اس کے تمام مشمولات بحیثیت مجموعی کیوں ان خصوصیات کے حامل ہیں کہ ان سے بوقلموں ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ کیا صرف یہ انسان کی تلاش اور دریافت کا نتیجہ ہے کہ اس نے ان اشیاء میں افادیت کے مختلف پہلوؤں کو ڈھونڈھ نکالا۔ یا افادیت کے یہ پہلو چونکہ پہلے سے اشیاء میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر و حکمت نے ودیعت کر رکھے تھے اس لیے ہماری طلب و جستجو کے نتیجے میں ہمیں معلوم ہوئے۔

ظاہر ہے تخلیق کا یہ انداز صاف صاف غمازی کرتا ہے کہ یہ عالم ہست و بود بغیر کسی حکمت و ارادہ کے یونہی اس انداز کا نہیں بن گیا ہے کہ انسان یہاں کی سازگاریوں سے لطف اندوز ہو سکے اور یہاں کی ایک ایک چیز کو اپنی ضرورتوں کے لیے استعمال کر سکے۔ یا یہ جانا بوجھا اور سوچا سمجھا ہوا نظام ہے جو انہی اغراض کے پیش نظر قائم کیا گیا ہے۔

ہم دراصل غایتی (Teleological) اسلوب فکر کی نمائندگی کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن حکیم نے اس عالم کے بارہ میں جس نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے اس سے علم اور سائنس کے تقاضے کہیں زیادہ خوبی سے تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب قرآن حکیم بار بار اس حقیقت کو بیان فرمائے گا کہ اس عالم کی ہر ہر شئے تمہارے لیے ہے حتی کہ یہ اتھاہ سمندر، وسیع و عریض زمین یہ تاباں اور فروزاں چاند اور سورج اور یہ لیل و نہار کی تبدیلیاں اور گردشیں تمام تر تمہارے ہی فائدے کے لیے وقف ہیں تو اس اسلوب اظہار سے لامحالہ انسان کے دل میں ان سب کو جاننے کی شدید خواہش کروٹ لے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ غایتی طرز استدلال پر کچھ اعتراضات بھی وارد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان میں کا سب سے زیادہ مشکل اور تیکھا سوال یہ ہے کہ اگر کائنات کا یہ مرقع کسی باکمال ذات کا نقش حسیں ہے تو اس میں مصیبت، ظلم، بیماری اور اندوہ و تشویش کے داغ دھبے کیوں نظر آتے ہیں۔ یا پھر ایک فلسفی کے الفاظ میں اگر اس دبستان کا نصف حصہ فکر، ذوق، حسن اور عقل و ہنر کے پھول بوٹوں سے آراستہ ہے تو دوسرے نصف حصے میں دشمنی، کینہ، بیماری اور حرص و آز کی عفونتوں کے ڈھیر کیوں پڑے ہیں؟

ہیوم نے اپنے مکالمات میں ایسی نوع کے اعتراضات پر تشکیک (Scepticism) کا قصر رفیع تعمیر کیا ہے کہ خیر میں آخر شر

Mujallah AlWaqia Karachi:::Al-Waqia.Blogspot.com:AlWaqiaMagzine.Wordpress.com:مجلہ الواقعۃ کراچی

مجلہ الواقعۃ کراچی

مولانا محمد حنیف ندوی

کے پیوند کی کیا ضرورت تھی اور حسن و زیبائی کے ساتھ قبح و عیب کی نمائش کا کیا موقع تھا؟ افلاطون نے تو یہ کہہ کر سوال کی سنگینی سے پیچھا چھڑا لیا کہ یہ عالم جس پر تم اعتراض کر رہے ہو حقیقی کب ہے؟ یہ تو حقیقت کی بھونڈی نکالی ہے۔ حقیقی عالم تصورات یا صور کا ہے جو واقعی خوبصورت مکمل اور غیر متغیر ہے۔ لیکن ہمارے لیے یہ مشکل ہے کہ جواب کی اس نوعیت پر اطمینان کا اظہار کر سکیں، اس لیے کہ ہم تو قرآن کی رو سے اس عالم کی معروضیت کے پُر زور حامی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس شکال سے نکلنے کی تین معقول صورتیں ہیں:

(1) یا تو ہم کیٹس (Keats) کے اس موقف کو تسلیم کر لیں کہ یہ عالم در حقیقت ایک درس گاہ ہے۔ جہاں عملی تربیت دی جاتی ہے کہ ہم شر اور تضاد کی ناساز گاریوں کو خیر و توافق کے سانچوں میں ڈھالنے کا فن سیکھیں۔ دوسرے لفظوں میں جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں جو تضاد و نقص پایا جاتا ہے وہ قدرت کے سہو و تغافل کا نتیجہ نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ ہماری عقل و دانش میں اضافہ ہو اور ہم یہ جان سکیں کہ ان پر قابو پانے کا کیا طریقہ ہے۔

(2) یا معتزلہ کی زبان میں یوں کہیں کہ یہ عالم اپنی موجود شکل ہی میں بہترین (Best Possible) ہے، اور شر و نقص کا احساس محض اضافی ہے۔ یعنی جزئیات کے ادھورے سے علم کی بناء پر ہے۔ اُس حکمت کی بناء پر نہیں جو ہمہ خیر اور خوبی ہے۔

(3) اور یا پھر بدرجہ آخر اس نقطہ نظر کو مان لیں کہ اعتراض کی یہ نوعیت اس عالم سے متعلق ہے جو ہنوز معرض تعمیر میں ہیں۔ یعنی اگر ارتقاء کا عمل جاری ہے اور اس عالم امکان کو ابھی اور نکھرنا ہے اور تکمیل و اتمام، کی مزید منزلیں طے کرنا ہے تو کیوں نہ نقص و شر کے اس عیب کو عبوری اور عارضی شئے قرار دیا جائے جس کو بالآخر انسان کی سعی اور کوشش سے مٹنا اور ختم ہونا ہے۔

ان مطالب کی تائید میں قرآن حکیم کے ان شواہد پر غور فرمائیے:

(1) ﴿ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ﴾ ((یٰس: 38))

"یہ اندازہ ہے عزیز اور صاحب علم خدا کا۔"

(2) ﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ((الکھف: 7))

"بلاشبہ جو کچھ زمین پر ہے اسے ہم نے اس کے لیے سنوارا اور بنایا تاکہ انہیں آزمائیں کہ ان میں کس کا کام بہتر ہے۔"

(3) ﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ﴾ ((الملک: 15))

"وہی ذات ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے رام کر دیا تاکہ تم اس کے گوشوں میں چلو پھرو اور اس کی دی ہوئی روزی میں سے کھاؤ اور اسی کی طرف جانا اور جی اٹھنا ہے۔"

(4) ﴿الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ﴾ ((الرحمٰن: 5))

"اور سورج اور چاند کا ایک حساب متعین ہے۔"

(5) ﴿قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ ((الطلاق:3))

"اور اللہ تعالیٰ نے ہر ہر شئے کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔"

(6) ﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ﴾ ((النحل: 12))

"اور تمہاری خدمت میں لگا دیا رات اور دن کو سورج اور چاند کو اور تمام نجوم و کواکب کو بھی مسخر کر دیا۔"

(7) ﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ﴾ ((الحج: 65))

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے جو کچھ زمین میں ہے، اس کو تمہارے لیے مسخر کر دیا۔"

(8) ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ﴾ ((دخان: ۳۸، انبیاء: 16))

"اور ہم نے زمین اور آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔"

وہ تیسرا نقطہ جو سائنس اور فلسفہ کی ارتقائی کڑیوں کو آگے بڑھانے کا باعث ہو سکتا ہے اور جس کی بدولت مسلمانوں نے تین چار صدیوں ہی میں علوم عقلیہ کو ثریا تک اچھال دیا، یہ تھا کہ فکر و دانش کی پرواز اور فطرت کے انکشافات میں کہیں ایسا موڑ نہیں آتا کہ جہاں دین کی استواریاں مجروح ہوں۔ قرآن حکیم نے جس نقطہ نظر کی پرورش کی، اس کا حاصل یہ تھا کہ عقل و دین میں کوئی تضاد پایا نہیں جاتا بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پرتو ہیں۔ جس پروردگار نے انسانی روح کی تابش وضو کے لیے اقدار کی تلقین کی ہے، زندگی کا نقشہ ترتیب دیا، اور انسان کی علمی رہنمائی کے لیے فقہ و قانون کے حسین سانچے بخشے ہیں، وہ بھلا یہ کیوں چاہے گا کہ اس کی عطا کردہ عقل و خرد کی صلاحیتیں ان اقدار کے خلاف پڑیں، زندگی کے اس نقشے کی تغلیط کریں، اور ربوبیت کے اس پہلو کو جھٹلانے کا باعث قرار پائیں کہ جس سے مقصود ہی یہ ہے کہ انسان کو اس کائنات میں اس کا صحیح صحیح مقام عطا کیا جائے اور ان تمام فکری و عقلی اور عملی خوبیوں سے مکمل طور سے نوازا جائے جو اس کو خلافت الٰہیہ کی مسند بلند پر فائز کرنے میں ممد و معاون ہو سکتی ہیں، مذہب و عقل میں دوئی کی ایک ہی صورت ممکن ہے جو یہ ہے کہ ہم کائنات میں ثنویت (DUALISM) کے قائل ہو جائیں، اور اس بات کو مان لیں کہ مذہب و دین کے تقاضوں کی تکمیل و ارتقاء تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، اور عقل و خرد کی طرفہ طرازیوں کی تخلیق کا ذمہ کسی ایسی قوت نے لے رکھا ہے جس کا تعلق خیر کے بجائے شر سے ہے، تضاد اور نفی سے ہے اور اس قوت نے عقل و خرد کی جدت طرازیوں کو پیدا ہی اس غرض سے کیا ہے تاکہ دونوں میں ہمیشہ ٹھنی رہے، اور کبھی بھی مصالحت اور یک جہتی قائم نہ ہو سکے۔ لیکن اگر انسان ایک ہے، اس کی فطرت ایک ہے، اور اس پوری کائنات میں ایک ہی خدا کی فرمانروائی اور حکومت کا سکہ رواں ہے، تب یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ ذہن و عقل میں تصادم و تضاد رونما ہو یا کسی درجے میں بھی دوئی پائی جائے کیونکہ جب دونوں کا سرچشمہ ایک ہے اصل اور جڑ ایک ہے تو اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان دونوں میں نہ صرف یہ کہ تضاد و تناقض نہ ہو بلکہ اس کے بر عکس کامل ہم آہنگی اور اتحاد پایا جائے، اور یہی وہ طرز فکر اور اسلوب نگاہ ہے جس کو قرآن حکیم نے عقل و ذہن کے بارہ میں اختیار کیا ہے۔

مذہب اور عقل یا دین اور سائنس کے تجربات زندگی کے دو لاینفک پہلو ہیں، جن سے کسی بھی طرح ہم دامن کشاں نہیں رہ

مجلہ الواقعۃ کراچی
Mujallah AlWaqiah Karachi::::Al-Waqia.Blogspot.com::::AlWaqiaMagzine.Wordpress.com

مولانا محمد حنیف ندوی

سکتے اس لیے کہ اگر ہم علم کے اس ذریعہ پر اعتماد نہیں کرتے ہیں جو ہمیں لاکھوں انبیاء کی وساطت سے پہنچا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس عظیم تہذیبی و روحانی ورثہ سے محرومی اختیار کر لیتے ہیں جس سے کہ کردار اور اخلاق سنورتے ہیں۔ ایمان و یقین کی دولت بے پایاں کی تعمیر حاصل ہوتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کی وجہ سے ہمیں تگ و دو، اور جد و جہد کے لیے ایک متعین اور بامعنی نصب العین دستیاب ہو تا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اگر ہم عقل و خرد کے تقاضوں کو بیدار نہ رکھیں تحقیق و مشاہدہ سے کام نہ لیں، نئے نئے تجربات و انکشافات سے بہرہ مند نہ ہوں اور اس بات کا اندازہ نہ کریں کہ ہمارے تجربات اور غور و فکر کس حد تک فطرت کے رازہائے سربستہ کو فاش کر سکتے ہیں تو اس سے جو نقصان پہنچے گا اس کا تحمل کب آسان ہے؟ اس سے ہماری شخصیت نامکمل رہے گی یعنی اپنے ان مضمرات عقلی کے اظہار سے قاصر رہے گی جو زمان و مکان میں نئے نئے انقلابات کی تخلیق کرتے رہتے ہیں، اور تہذیب و تمدن کے دائرے سکڑ کر خشک ہو جائیں گے، فکر ٹھس اور مردہ ہو جائے گی، اور زندگی کے پورے نظام کو وہ تازہ اور ساز گار آب و ہوا میسر نہیں آسکے گی جس میں کسی زندہ و متحرک ثقافت کا نہال پھلتا پھولتا اور پنپتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں گویا ہمیں اگر بھرپور زندگی بسر کرنا ہے اور فکر و نظر کے دقائق سے لے کر قلب و روح کے لطائف تک ہر ہر شئے سے استفادہ کرنا ہے تو ضروری ہے کہ ہم ایسا مدرسہ فکر تسلیم کریں جو دین و دنیا اور عقل و مذہب دونوں کی برکات کا یکساں حامل ہو، اور خدا کا شکر ہے کہ ہمارا مدرسہ فکر اسلام اپنے دامن میں ان دونوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ قرآن حکیم اس بات کی تصریح کرتا ہے کہ کسی شخص کے پہلو میں دو دل نہیں ہو سکتے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم عقائد و تصورات میں ثنویت برقرار نہیں رکھ سکتے یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن و سنت کی تعلیمات سے ہم کائنات، فطرت یا اپنے گرد و پیش کے حالات کے بارہ میں ایک رائے قائم کریں اور علوم و فنون سے اخذ کردہ نتائج کی بناء پر ہم جن تصورات و عقائد کو حق بجانب سمجھیں وہ دوسری نوعیت کے حامل ہوں۔ اگر مذہب و دین اللہ کا پیغام ہے اور اس علم ازلی کی فیض رسانیوں کا نتیجہ یہ ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل کے بارہ میں کسی لغزش یا کوتاہی کا امکان نہیں تو پھر یہ ضروری ہے کہ اس سے اخذ کردہ تعلیمات کسی طرح بھی روح عصر کے منافی نہ ہوں یعنی کسی بھی دور میں علم و تجربہ کا کوئی بھی انکشاف اہل حق کے حلقوں میں اچھنبا نہ پیدا کر سکے۔ بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ جب بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقیات سے کوئی نئی حقیقت فکر و نظر کے سامنے آئے ایسا معلوم ہو کہ اس میں کوئی انوکھا پن نہیں بلکہ اصولی حد تک جانی پہچانی سی حقیقت ہے۔ ہاں یہ بات البتہ صحیح ہے کہ کبھی کبھی ان میں تصادم و تضاد محسوس ہو تا ہے اور ایسی شدت اختیار کر لیتا ہے کہ گویا یہ دونوں باہم حریف ہیں، جن میں فیصلہ کن لڑائی چھڑ گئی ہے اور نظر بہ ظاہر اب صرف یہی امکان باقی ہے کہ دونوں میں سے ایک زندہ رہے اور دوسرا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی شکست تسلیم کرلے۔ جن لوگوں نے مغرب میں احیائے علوم کی تحریک کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ کلیسا اور سائنس کے مابین اس طرح کے متعدد موڑ آئے ہیں جن میں دونوں حریف خم ٹھونک کر ایک دوسرے کے مقابلے میں آکھڑے ہوئے ہیں۔

لیکن تصادم کی یہ شکل عارضی ثابت ہوئی ہے اور بعد کی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ اصل میں ان دونوں میں تصادم غلط فہمی کا نتیجہ ہے اور عموماً اس وقت محسوس ہو تا ہے جب یا تو مذہب و دین کی تعبیر صحیح اصولوں پر مبنی نہ ہو اور یا پھر سائنس اور علوم سے غیر سائنسی اور غیر علمی نتائج اخذ کیے جائیں۔ اگر مذہب کی تعبیر و تشریح میں ان سائنٹیفک اور علمی اصولوں کو مد نظر رکھا جائے کہ جن کی روشنی میں کسی بلند تر حقیقت کی صحیح معنوں میں تعیین ہوتی ہے اور سائنس سے نہ صرف وہی نتائج اخذ کیے جائیں جو آخری اور اٹل ہوں تو ناممکن ہے کہ دونوں میں ذرہ بھی اختلاف رونما ہو۔

علاوہ ازیں یہ تصادم اور تضاد بڑی حد تک ہماری جلد بازی اور بے صبری کا رہین منت بھی ہو تا ہے۔ ہماری عادت یہ ہے کہ سائنس کے ہر نئے انکشاف پر شور مچا دیتے ہیں کہ بس اب مذہب و دین کی خیر نہیں۔ حالانکہ وہ انکشاف کسی حیثیت میں بھی آخری اور فیصلہ کن نہیں ہوتا۔ بلکہ اگلے انکشاف کی محض تمہید ہوتا ہے اور اگلا انکشاف اگر حرف آخر بھی ہو تب بھی اس سے اصول دین کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ بلکہ اس کے برعکس ہوتا صرف یہ ہے کہ بعض جزئی اور تشریح طلب مسائل میں مذہب و دین کی تشریح و تعبیر کا انداز و اسلوب بدل جاتا ہے اور پہلے سے کہیں زیادہ لطیف اور زیادہ اونچا ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں زیادہ یقین افروز بھی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے مطالعہ کائنات پر بہت زور دیا ہے۔ اور بار بار فکر و ذہن کو متوجہ کیا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی وسیع تر دنیا پر غور کرے۔ آسمان کو دیکھے زمین کو دیکھے۔ اختلاف لیل و نہار کو ہدف تعقل ٹھہرائے۔ ہواؤں کے دوش پر سوار ہو۔ سحاب و ابر کی فیض رسانیوں کے حدود کا جائزہ لے۔ پہاڑوں کی استواری کو زیر بحث لائے۔ اونٹ کو دیکھے اور فطرت کے ان عجائبات کو ملاحظہ کرے جو اس کی تخلیق میں ودیعت کر دیے گئے ہیں۔ فکر و نظر اور غور و تفحص کی یہ دعوت چوتھائی نکتہ یا پہلو ہے جس کی بناء پر مسلمانوں میں علوم عقلیہ کے لیے طلب و جستجو کے داعیے پیدا ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان صحرا نوردوں نے محض اسلام کی بدولت تہذیب و تمدن کے بلند ترین میناروں کو چھو لیا۔ اور طب، کیمیا، جغرافیہ، فلکیات، منطق، فلسفہ اور کلام میں اتنی ترقی کی کہ برسوں یورپ ان کی تحقیقات کو جویاں رہا۔

مطالعہ و مشاہدہ کی اس دعوت میں دو باتیں خصوصیت سے قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن حکیم نے جس فکر و تعمق کی دعوت دی وہ ارسطاطالیسی استخراجی فکر نہیں ہے کہ جو نتائج کے اعتبار سے بالکل عقیم اور بے ثمر ہے اور جس سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ بلکہ فکر و تعمق کا مزاج استقرائی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جزئیات کے مطالعہ و تجربہ سے کلیات اخذ کیے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ راہ ٹھیٹھ سائنس کی راہ ہے اور اس میں نت نئے انکشافات کا بہر حال خطرہ موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن حکیم کا اصرار ہے کہ تم اس نہج پر غور کرو اور اسی انداز سے سوچو۔ اور فکر و نظر کی ضیاء افروزیوں کو عام کرو۔ اللہ تعالیٰ جو علام الغیوب ہے خوب جانتا ہے کہ اس راہ کے خطرات کیا ہیں اور اس مطالعہ و تحقیق سے علمی دنیا میں کیا کیا انقلاب آنے

Mujallah AlWaqia Karachi ::: Al-Waqia Blogspot.Com ::: Al-Waqia Magzine.Wordpress.Com ::: مجلہ الواقعہ کراچی

والے ہیں۔اس کے ہوتے ساتے جب رب کائنات کا حکم ہے کہ مسلمان ذہنوں کو ٹھس نہ ہونے دیں۔علم و تحقیق کی شمعوں کو روشن رکھیں اور تحقیق و تفحص کا پرچم چار دانگ عالم میں لہراتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم جن نظام حیات کا داعی ہے اس میں اور عقل کی تیز رفتاریوں میں کہیں تصادم و تناقض کا خطرہ پنہاں نہیں۔

یہ ہے قرآن کا فلسفہ اور سائنس کی ترویج میں فکری حصہ ۔ تفصیل اور حوالہ کے لیے درج ذیل آیات پر غور فرمائیے:

(فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفاً فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا) ((روم: 30))

"سو تم یک سو ہو کر رخ اس دین کی طرف رکھو اور اطاعت اس اسلوب کی کرو جو اس فطرت پر مبنی ہے کہ جس پر تمام لوگوں کو پیدا کیا گیا ہے۔"

(يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْراً كَثِيراً) ((البقرة: 269))

"حکمت و دانش جسے چاہتے ہیں ارزانی فرما دیتے ہیں اور جس کو حکمت و دانش سے نوازا گیا اسے بڑی چیز مل گئی۔"

(قَدْ جَاءَكُم بَصَآئِرُ مِن رَّبِّكُمْ) ((الانعام: 104))

"بلا شبہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے بصائر آچکے ہیں۔"

(وَمِنهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ) ((البقرة: 201))

"اور ان میں کچھ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجیے اور آخرت میں بھی بہتری سے بہرہ مند کیجیے اور ہم کو آگ کے عذاب سے محفوظ رکھیے۔"

(مَّا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّن قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ) ((الاحزاب: 4))

"اللہ نے کسی شخص کے سینہ میں دو دل نہیں رکھے۔"

(أَفَلَمْ يَنظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ ۔ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۔ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ) ((ق: 6-8))

"کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کیونکر بنایا ہے۔اور کیونکر آراستہ کیا اور سجایا ہے۔اور اس میں کوئی رخنہ تک نہیں۔اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور بچھایا۔اور اس میں پہاڑوں کو جمایا اور اس میں ہر طرح کی خوش منظر چیزیں اگائیں اس لیے کہ اس کی طرف رجوع ہونے والا ہر بندہ ان پر غور کرے اور عبرت پذیر ہو۔"

(إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ) ((البقرة: 164))

"بلا شبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں۔اور یکے بعد دیگرے دن کے آنے میں۔اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں، آدمیوں کے نفع کی چیزیں اور اسباب لے کر اور بارش کے پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا۔پھر اس سے زمین کو زندہ کیا جب کہ یہ خشک ہو چکی تھی۔اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور ابر میں جو آسمان اور زمین کے مابین مسخر ہے۔دلائل ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔"

غرض یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو علم و فن کی ترقی ہوئی اور کندی، رازی، ابن ماجہ، ابن سینا، فارابی اور ابن رشد و غزالی ایسے عظیم مفکرین پیدا ہوئے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ یونان و ایران کے سرمایہ تہذیب و تمدن نے ان کے قلب و ذہن میں یکایک تبدیلی پیدا کر دی تھی بلکہ اس کی بڑی اور بنیادی وجہ وہ داخلی انقلاب تھا جس کو قرآن حکیم کی تعلیمات نے پیدا کیا اور وہ تڑپ اور لگن تھی جو اسلامی تعلیمات کے نتیجے میں خود بخود کاوش و جستجو کا باعث ہوئی۔ورنہ یہ وہی عرب تھے جو کافور کو نمک سمجھتے تھے اور چاندی کو سونے سے زیادہ قیمتی جانتے تھے۔ جو طرح طرح کے اوہام کا شکار تھے۔

Mujallah AlWaqia Karachi :::Al-Waqia.Blogspot.com:::AlWaqiaMagzine.Wordpress.com:::مجلہ الواقعۃ کراچی